ہندوستان کی تاریخ کو کیسے مسخ کیا گیا؟

محمد عمر، پاکستان

آپ کو یاد ہو گا لڑکپن میں مطالعہ پاکستان کے پرچے میں قائداعظم کے 14 نکات کے علاوہ جو ایک سوال تواتر سے پوچھا جاتا تھا وہ تھا مغلوں کے زوال کے اسباب بیان کریں۔ اور جس طرح طالبعلم 14 نکات کو رٹتے تھے اسی طرح کوئی سولہ یا سترہ کے قریب زوال کے اسباب بھی یاد کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ ابھی بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ مثلاً مغل شہزادوں کی عیاشیاں، آپس کی ریشہ دوانیاں، سائنس اور ٹیکنالوجی پر توجہ نہ دینا، فوجی قوت کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کرنا، مراٹھوں کی بغاوت وغیرہ وغیرہ۔ آج بھی اس سوال کا ایسا ہی جواب بچوں کو پڑھایا جا رہا ہے۔ معاشرتی علوم کی ساتویں جماعت کی کتاب چند روز قبل میری نظروں سے گزری، جس میں درج مغلوں کے زوال کا پہلا سبب پیش خدمت ہے۔

The Ruling class, especially Mughal Court, had rapidly grown corrupt both ethically and morally. After the death of Aurangzeb, his successors proved inept, abundance of wealth created problems, martial way of life became tough for rulers and drinking was the norm of the day.

زوال کے پہلے سبب میں اورنگزیب کے ساتھ کچھ رعایت روا رکھی گئی اور یہ تاثر دیا گیا کہ زوال اورنگزیب کے بعد آیا۔ مگر دوسرے سبب میں اورنگزیب کی پالیسیوں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے:

The Mughal Empire lacked the ideology base. It was only Aurangzeb (1658-1707) a later Mughal ruler, who declared Islam as a state religion and tried to put state affairs in line with Shariah. But as such a belated stage, it only promoted the anti-Mughal resentment in minorities of the subcontinent. As a result, Aurangzeb got engaged in a series of local insurgencies including the campaigns against the Sikhs of Punjab and Marathas of South India. The central government weakened and the provinces grew autonomous that created financial crunch for the centre.

مطلب پوری کی پوری مغل ایمپائر کسی بھی نظریہ پر کھڑی نہ تھی۔ اورنگزیب پہلا اور آخری حکمران تھا جس نے اسلام کو ریاست کے مذہب کے طور پر اختیار کیا اور کوشش کی کہ ریاستی امور کو شریعت کے مطابق چلایا جائے۔ مگر شریعہ کے نفاذ کی یہ کوشش اقلیتوں کیلئے بے چینی کا باعث بنی اور سکھوں اور مراٹھوں کی بغاوت نے سر اٹھا لیا۔

یقیناً مغلیہ حکومت کے زوال کے کچھ اسباب بھی تھے ظاہر ہے کہ زوال کا سفر بے سبب تو نہ تھا۔ مگر اوپر بیان کئے گئے ان دو اسباب میں ہی ہمیں ایک تضاد نظر آتا ہے۔ پہلے سبب میں یہ کہا گیا کہ اورنگزیب کی وفات کے بعد ان کے جانشین نااہل ثابت ہوئے اور دولت کی فراوانی بھی مسائل کا باعث بنی۔ جبکہ دوسرے سبب میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ ریاستوں کی خود مختاری کے باعث مرکز کمزور ہوا اور اسے مالی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح جہاں ایک طرف تو شریعت کے نفاذ کی تعریف کی گئی دوسری طرف اسی نفاذ کو زوال کا سب سے بڑا سبب گردانا گیا۔

بہر حال زوال کے اسباب کے بارے میں اس سوال کا جواب تحریر کرتے کرتے مغل حکمرانوں کے بارے میں ایک خاص نقطہ نظر پروان چڑھتا ہے۔ اور وہ 'نقطہ نظر' یہ ہے کہ یہ مطلق العنان بادشاہ تھے۔ عیاشیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پڑھنے لکھنے سے ان کا دور دور تک کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ اقتدار کے لالچ نے ان کو اندھا کر دیا تھا۔ ہر وقت آپس میں جنگ و جدل میں مصروف رہتے وغیرہ وغیرہ۔

زوال کا یہ نظریہ دھیرے دھیرے ہندوستان کے بسنے والوں کے دماغوں میں ڈالا گیا۔ اور اگر مغل حکومت کو زوال ہو بھی رہا تھا تو اسے ہندوستانی معاشرے کے زوال کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس نظریے کو نہ صرف تاریخ بلکہ نصاب کی کتابوں کے ذریعے بھی پروان چڑھایا گیا۔ زوال کے اسی نظریے کے بارے میں معروف پاکستانی مورخ ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب برطانوی راج میں لکھتا ہے، "ہندوستان میں برطانوی اقتدار اور اس کے پھیلاؤ کو زوال کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے اس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ مغل زوال کے بعد ہندوستان کا معاشرہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر رہا تھا، اس کی معیشت تباہ ہو رہی تھی، اس کی اخلاقی اقدار گر رہی تھیں۔ اس کے سماجی اور ثقافتی ادارے ٹوٹ رہے تھے۔ ان حالات میں جب طاقت و اقتدار کا خلا تھا، اس وقت انگریزی حکومت نے اسے پُر کیا اور ہندوستان کے حالات کو سنبھالا۔ انہوں نے خانہ جنگی کو ختم کیا، ٹھگوں، ڈاکوؤں اور لٹیروں سے راستوں کو محفوظ کیا، ملک میں امن و امان کو بحال کیا اور ایک ایسی مضبوط ریاست کی بنیاد ڈالی کہ جس نے سیاسی اور معاشی استحکام

کو پیدا کیا۔۔۔ جتنا زوال اور اس کے نتائج کو بیان کیا جائے گا اسی قدر انگریزی اقتدار کی اہمیت بڑھتی چلی جائے گی۔ گویا انگریزوں نے ہندوستان کی ایک تاریک تصویر کھینچی کہ جس میں وہ روشنی بن کر آتے ہیں اور زوال کے عمل کو روک کر یہاں استحکام پیدا کرتے ہیں۔"

معروف برطانوی ادیب اور مورخ بیورلی نکلس نے اپنی کتاب ورڈِکٹ آن انڈیا میں لکھا تھا۔ "جلد یا بدیر ایک وقت آئے گا جبکہ دنیا یہ محسوس کرے گی کہ برطانیہ کا ذہنی اور علمی اقتدار ہندوستان سے کبھی زائل نہیں ہو گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم سے کچھ کوتاہیاں اور غلطیاں سرزد ہوئیں۔ کبھی کبھی جذبات کی رو میں ہم آپے سے باہر بھی ہو گئے اور بارہا ہم تنگ خیالی کے مرتکب ہوئے۔ ان سب کے باوجود ہم نے ہندوستان کو امن عطا کیا۔ وہ امن جس کی بنیاد تباہ کاری پر نہ تھی۔ ہم نے ہندوستان کو قانون دیا۔ وہ قانون جس میں جبر و تشدد کو دخل نہ تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم نے ہندوستان کو آزادی کی دولت بخشی۔ کیونکہ ملٹن، لاک، مل، برائٹ اور گلیڈ اسٹون کے اعلیٰ خیالات ہی کی بدولت سب سے پہلے ہندوستانیوں کے دماغ روشن ہوئے اور انہوں نے آزادی کے حقیقی مفہوم کو سمجھا۔"

نو آبادیاتی دور میں مختلف علاقوں کی فتوحات کے بعد استعماری کفار نے مقبوضہ علاقوں کے عوام کو ذہنی طور پر غلام بنانے کیلئے دقیق منصوبہ بندی کی۔ تاریخ کی تبدیلی انہی کوششوں میں سے ایک تھی۔ تاریخی حقائق کو خاص مقاصد کے تحت مسخ کرنے کی کوشش کی گئی۔ محکوم قوموں کو دبانے، انہیں احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے اور اپنے جابرانہ تسلط کا جواز گھڑنے کیلئے تاریخ کی بھیانک منظر کشی کی گئی۔ تاکہ یہ قومیں اپنے ماضی کے حوالے سے ہمیشہ شرمندہ رہیں۔ اور ان شرمندہ قوموں کو یہ سمجھا دیا جاتا ہے کہ جو قومیں ماضی میں کچھ نہ کر سکیں وہ حال میں بھی کچھ نہیں کر سکتیں اور مستقبل میں بھی ان کا کوئی حصہ نہیں۔

ہندوستان کی تاریخ بھی ایسی ہی ایک مسخ کردہ تاریخ ہے۔ یہاں ہمیں ہر دور کے حوالے سے مختلف قسم کی آراء مل سکتی ہیں۔ مسلمان حکمرانوں کے ادوار تو خاص طور پر مورخین کا تختہ مشق رہے۔ محمد بن قاسم سے لیکر، غزنوی اور غوری اور پھر مغل حکمرانوں تک، تمام ادوار کو متنازع بنایا گیا۔ اکبر اور اورنگزیب کے حوالے سے بھی ہمیں مختلف قسم کی آراء نظر آتی ہیں۔

تاریخ میں تخریب کا پہلو اورینٹلزم یعنی استشراق سے بہت گہرائی سے جڑا ہوا ہے، اگر ہم چند سطروں میں اورینٹلزم کو سمجھ لیں گے تو نو آبادیاتی دور میں تاریخ سے کئے گئے کھلواڑ کی وجوہات جاننے میں مدد ملے گی۔ اورینٹلسٹس یا مستشرقین کی اصطلاح بنیادی طور پر ان مغربی دانشوروں اور مصنفوں کے لئے استعمال کی جاتی ہے جو مشرق کو اپنی تحقیق کا موضوع بناتے ہیں۔ ابتدائی مستشرقین ایشیا اور افریقہ کے باسیوں کو ایک مختلف انداز سے دیکھتے تھے۔ یعنی وہ ان اقوام کو یورپی اقوام سے مختلف خیال کرتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب یورپ میں سائنسی ترقی شروع ہو چکی تھی اور وہ صنعتی ترقی کی طرف گامزن تھے۔ مستشرقین نے اپنے معاشروں کے سامنے ہندوستانیوں کی کم و بیش ایسی ہی تصویر پیش کی جیسی آج کل ہمارے سامنے کافرستان یا وادی کیلاش کی پیش کی جاتی ہے۔ مستشرقین کا خیال تھا کہ مشرق کے باسی ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے مغرب سے کمتر ہیں۔ خصوصاً ہندوستان کے باسی تو اس قابل بھی نہیں کہ وہ امور مملکت چلا سکیں۔ اس لئے یہ بات ہندوستان کے باسیوں کیلئے باعث فخر و اطمینان ہونی چاہئے کہ اب عظیم برطانیہ ان کی امداد کو آن پہنچا ہے۔ اور اب جلد ہندوستان بھی اصلاح کے راستے پر گامزن ہو گا۔ یہ تھا وہ سارا ماحول جس میں برطانوی استعمار ہندوستان کی تاریخ کو بدلنے کے درپے تھا۔

ہندوستان پر اقتدار کے استحکام کیلئے سب سے پہلے تو یہ ضروری تھا کہ انگریز خود ہندوستان کے بارے میں آگاہی حاصل کرے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے ۱۷۸۴ کو کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس سوسائٹی کی میٹنگز میں ہندوستان کی تاریخ، زبانوں، مذاہب اور رسوم و رواج کو زیر بحث لایا جاتا۔ یہ میٹنگز استعماری مقاصد کے تحت تھیں اسی لیے کئی سال تک کسی بھی ہندوستانی کیلئے اس سوسائٹی کی رکنیت ممنوع رہی۔ حالانکہ سوسائٹی کے اجلاسوں میں اپنی معلومات پیش کرنے والے بہت سے گورے مقامی اسکالرز سے استفادہ حاصل کر رہے ہوتے تھے۔

یورپی مفکرین اور تاریخ دانوں نے ہندوستان کو محض ہندو اور سنسکرت تہذیب کے طور پر پیش کیا۔ اور ترک، افغان اور مغل حکمرانوں کے ادوار میں فارسی زبان میں تحریر کئے گئے ان تمام تاریخی ماخذوں کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ ہندوستانی تہذیب سے مطابقت نہیں رکھتے۔ باوجودیکہ ان ماخذوں میں ہندوستانی سیاست اور معاشرت کو ہی بیان کیا گیا اور ان کے لکھنے والے بھی ہندوستان میں بسنے کے بعد اسی معاشرے کا حصہ بن گئے تھے۔ تاریخ میں محض ہندوازم اور سنسکرت کو ہی اجاگر کیا گیا جبکہ دوسری ثقافتوں اور مذاہب جیسا کہ بدھ ازم، جین ازم اور اسلام کو ہندوستانی تہذیب کو پروان چڑھانے کے حوالے سے بمشکل ہی تسلیم کیا گیا۔ بھارتی مورخ رومیلہ تھاپڑ کے بقول یورپ کی اسلام سے دشمنی کی تاریخی وجوہات سمجھ میں آتی ہیں، جن کا آغاز ہمیں صلیبی جنگوں سے ملتا ہے۔

ابتدا میں یورپ کے صنعتی انقلاب اور اس سے آنے والی تبدیلیوں سے خوفزدہ کچھ مستشرقین نے ہندوستان سے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ ان میں جرمن مصنفین ہرڈر، ول ہیلم، آگسٹے شلیگل، نوالیس اور انگریز شاعر ورڈزورتھ اور کالرج شامل ہیں۔ مگر پسندیدگی کا یہ وقتی اظہار انیسویں صدی میں مغربی تہذیب کی بالادستی کے اظہار میں تبدیل ہو گی

اور مشرقی تہذیبوں کے بارے میں یہ خیال نمایاں ہوا کہ کسی زمانے میں یہ تہذیبیں عظیم تو تھیں مگر اب زوال کا شکار ہیں۔ان خیالات نے انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کی مڈل کلاس کی اپنے ماضی کے بارے میں سوچ کو بھی متاثر کیا۔رومیلہ تھاپر لکھتی ہے:

There was an attempt to formulate Indian culture as uniform, such formulations being derived from texts that were given priority. The So-called 'discovery' of India was largely through selected literature of Sanskrit.

یورپی مفکرین کی ایک بڑی جماعت ہندوستانی ثقافت پر تنقید میں مصروف ہوگئی۔ان میں سر فہرست جیمز مِل اور لارڈ میکالے کے نام شامل ہیں۔جیمز مِل وہ پہلا مورخ تھا جس نے ہندوستانی تاریخ کو تین مذہبی ادوار یعنی ہندو، مسلم اور برطانوی میں تقسیم کیا۔نہ صرف یہ بلکہ اس نے پرانے ہندو دور کو گولڈن، مسلم دور کو ڈارک اور برطانوی دور کو ماڈرن ادوار کے خطابات بھی دیئے۔جیمز مل کی کتاب ہسٹری آف برٹش انڈیا بعد میں آنے والی تاریخ کی کتابوں کیلئے ایک اہم ماخذ کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔جیمز مِل نے ہندوستان کی تاریخ پر ایک ضخیم کتاب تحریر کی مگر وہ کبھی ہندوستان نہیں آیا تھا! تاہم کتاب لکھنے کے انعام میں جیمز مل کو بھاری تنخواہ پر ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت مل گئی۔اور بعد میں جیمز مل کا بیٹا اور معروف فلاسفر جان اسٹیوارٹ مِل جو اپنی تصنیف "آن لبرٹی" سے مشہور ہوا بھی کمپنی کا ملازم ہوا۔جان اسٹیورٹ مل نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں قریب 35 برس تک ملازمت کی۔

جان اسٹیورٹ مل اپنے والد جیمز مل سے بھی چار ہاتھ آگے نکلا۔جے ایس مل نے ہندوستان پر برطانوی قبضے کا خوب دفاع کیا۔جو نیئر مل کا کہنا تھا کہ مہذب اور وحشی معاشروں میں موجود بنیادی فرق کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔جان اسٹیورٹ کا خیال تھا کہ چین اور ہندوستان دونوں کسی زمانے میں ترقی پسند ممالک تھے جو اب جمود کا شکار ہو چکے ہیں۔جہاں مِل نے اپنی تصنیف آن لبرٹی میں فرد کی آزادی پر معاشرے کے اختیار کی حدود پر بات کی۔وہیں مل نے یہ بھی واضح کیا کہ آزادی کا یہ تصور تمام افراد اور تمام معاشروں کیلئے نہیں ہے۔جان اسٹیورٹ مل کہتا ہے وحشیوں سے نمٹنے کیلئے جابرانہ طرز حکومت ہی واحد حل ہے۔

ادھر لارڈ میکالے کا کردار بھی خاصہ اہم ہے۔میکالے جس نے ہندوستان میں نام نہاد جدید نظام تعلیم متعارف کرایا۔وہ بھی ہندوستانی معاشرے کے بارے میں جان اسٹیورٹ مل کا ہم خیال تھا۔وہ سمجھتا تھا دنیا مہذب اور غیر مہذب اقوام میں تقسیم ہے جبکہ برطانوی معاشرہ تہذیب کی انتہائی اعلیٰ سطح پر موجود ہے۔

میکالے نے ہی یہاں انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر پیش کیا اور مغربی افکار کو تعلیمی نظام کا حصہ بنایا۔حیرت انگیز طور پر جب انگریزی ادب کا مضمون ہندوستانی تعلیمی اداروں میں پڑھایا جارہا تھا تب یہ برطانیہ کی کسی یونیورسٹی کے نصاب میں موجود نہیں تھا۔

برطانوی دور میں ہندوستان کی نئی تاریخ مرتب کرتے ہوئے اس بات کا بھی خیال رکھا گیا کہ غیر مسلموں کے سامنے مسلمان حکمرانوں کا ظالم چہرہ پیش کیا جائے۔اور اسی کوشش میں ایک معاملہ ہندوستان کے مقامی افراد کو زبردستی مسلمان کرنے کے الزام کا بھی ہے۔اس بات کو تاریخ کی کتابوں میں اس طور سے دہرایا گیا کہ اسے ہی سچ سمجھا جانے لگا۔محمود غزنوی پر ایک ہزار پندرہ میں کشمیر میں لوٹ مار اور مقامی لوگوں کو زبردستی مسلمان کرنے کے الزام لگائے گئے۔اسی طرح بعد کے حملوں میں موجودہ یوپی کے شہروں ماٹھورا اور کنوج اور راجھستان کے ضلع باران میں بھی طاقت کے ذریعے مذہب کی تبدیلی کی بات کی گئی۔محمد غوری کے بارے میں بھی یہ کہا گیا کے ان کے حملوں میں ہزاروں لوگوں کو غلام بنایا گیا اور آزادی کیلئے مسلمان ہونے کی شرط رکھی گئی۔چودھویں صدی عیسوی میں کشمیر کے مسلمان سلطان سکندر بت شکن اور مغل حکمران اورنگزیب کے بارے میں بھی ایسی ہی باتیں دہرائی گئیں۔مورخین ٹائٹس مرے، رامیش چندر اماجومدار، کے ایس لال اور شری رام بخشی نے ان واقعات کو بیان کیا ہے۔

رامیش چندر اماجومدار برطانوی دور میں کلکتہ یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر تھا۔1937 سے 42 تک یونیورسٹی آف ڈھاکہ کا وائس چانسلر بھی رہا۔تقسیم ہند کے بعد اسے تحریک آزادی کی تاریخ مرتب کرنے کیلئے قائم کی گئی حکومتی کمیٹی میں شامل کیا گیا۔تب سوال پیدا ہوا کہ تحریک آزادی کی تاریخ کہاں سے شروع کی جائے؟ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اسے 1857 کی جنگ آزادی سے شروع ہونا چاہئے۔جبکہ رامیش چندر انے اس بات پر بھارتی وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد سے اختلاف کیا اور کمیٹی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔رامیش چندر انے جنگ آزادی کو محض sepoy mutiny کا نام دیا۔اس کا خیال تھا کہ تحریک آزادی صحیح معنوں میں اس وقت شروع ہوئی جب ہندوستان کی انگریزی تعلیم یافتہ مڈل کلاس سیاست میں آئی۔وہ تحریک آزادی کی شروعات کو 1905 کی تقسیم بنگال کے خلاف تحریک بنگابھانگا سے منسوب کرتا ہے۔رامیش چندر ا بھی انگریزی نظام تعلیم کی پیداوار تھا۔اس کی مرتب کردہ تاریخ کی کتابوں میں جگہ جگہ مسلمانوں کے ہندوں پر مظالم اور زبردستی مذہب کی تبدیلی کا ذکر ملتا ہے۔وہ اپنی کتابوں میں ہربرٹ ہوپ رزلے، بیورلے نکلس اور ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی تحقیق کا بھی ذکر کرتا ہے۔رزلے اور ہنٹر دونوں ہی انڈین سول سروس کا حصہ تھے۔اور انہوں نے اپنی کتابوں میں اسلام کے تلوار کے زور پر پھیلانے کے نظریے کا پرچار کیا ہے۔

نوآبادیاتی دور کے کسی بھی مورخ نے یہ وضاحت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ طاقت کے ذریعے مذہب کی تبدیلی عملی طور پر کس طرح ممکن ہوئی۔پھر اگر تلوار کے اس نظریے کو مان لیا جائے تو اس کے مطابق ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جن علاقوں پر مسلمانوں کا اقتدار زیادہ مضبوط اور دیرپا تھا وہاں مسلمانوں کی آبادی بھی زیادہ ہوتی۔لیکن حقیقت

اس کے برعکس ہے۔ مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب، جہاں اسلام سب سے زیادہ تیزی سے پھیلا۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں مسلمان حکمرانوں کی تلوار سب سے زیادہ کمزور تھی۔ ان علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی کل آبادی کا ستر سے نوے فیصد تھی۔ دوسری طرف وہ علاقے جہاں مسلم حکمرانوں کا اقتدار زیادہ مضبوط تھا مثلاً دلی اور آگرہ، یہاں مسلمان کل آبادی کا محض دس سے پندرہ فیصد تھے۔

ایک اور اہم معاملہ محمود غزنوی کے سومنات پر حملے کا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں اس واقعے کو بھی مختلف انداز سے پیش کیا گیا۔ ان حملوں سے متعلق اتنی زیادہ کہانیاں ہیں کہ سچ تک پہنچنا بہت ہی مشکل لگتا ہے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ وہ بھی درست نہیں جسے آج بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ محمود غزنوی نے سومنات پر آخری حملہ ایک ہزار چھبیس میں کیا۔ ان حملوں سے متعلق پانچ مختلف قسم کے بیانئے موجود ہیں۔ اور پانچوں بیانیوں میں بھی جگہ جگہ تضادات ہیں۔ ترکی اور فارسی ماخذ، سنسکرت تحاریر اور جینا یعنی جین ازم کے ماخذ کے علاوہ برطانوی پارلیمنٹ کی بحث اور پھر بھارت میں ہندو قوم پرستی کا بیانیہ۔ کہیں کہا گیا کہ سومنات کے مندر میں نصب بت پتھر کا تھا، کہیں یہ کہ وہ لوہے کا تھا اور مقناطیس کی مدد سے ہوا میں معلق تھا۔ کسی نے لکھا کہ پتھر کے بت کے پیٹ کو جب پھاڑا گیا تو اس میں سے کئی من سونا برآمد ہوا۔ کسی نے یہ بھی لکھا کہ یہ وہ منات کا بت تھا جو فتح مکہ کے وقت خانہ کعبہ سے غائب کر دیا گیا تھا۔ لات اور عزی نامی بتوں کو توڑ دیا گیا تھا۔ کسی نے یہ وضاحت نہیں کی کہ محمود غزنوی غزنی سے گجرات تک ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے پہنچا۔ اس نے ہندوستان میں موجود دیگر ہزاروں مندروں کو کیوں نہ نقصان پہنچایا؟ اسی طرح اگر سومنات کے مندر پر حملہ اتنا ہی سنگین واقعہ تھا تو اس کے بعد وہاں مسلمانوں اور ہندوں کے درمیان فسادات کیوں نہ پھوٹے؟

لیکن محمود غزنوی کے ان حملوں کی کہانیوں سے اگر کسی کو کوئی فائدہ ہوا تو وہ انگریز تھا۔ 1843 میں گورنر جنرل ایلن برو نے اعلان کیا کہ سومنات کے مندر سے دروازے چرا کر غزنی میں نصب کئے گئے۔ ہندوستان کا یہ اثاثہ واپس لایا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد برطانوی پارلیمنٹ میں ایک بحث ہوئی جس میں یہ ثابت کیا گیا کہ مندر کی تباہی ہندو مذہب کی توہین ہے۔ ان دروازوں کو واپس لا کر اس عزت کو بحال کیا جائے۔ اس بحث کا ایک مقصد افغانستان میں ہونے والی جنگ کیلئے ہندوؤں کی فوجی بھرتی تھا اور دوسرا ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانا۔ بہرحال جب ان دروازوں کو اکھاڑ کر ہندوستان لایا گیا تو ان پر لکھی قرآنی آیات سے معلوم ہوا کہ ان کا تعلق مصر سے ہے!

اسی طرح تاریخ ہندوستان کے ایک اور عظیم کردار اورنگزیب عالمگیر کی شخصیت کو بھی محض اس لئے متنازع بنایا گیا کہ وہ مذہبی طور پر ایک راسخ العقیدہ شخص تھا۔ مورخین نے اورنگزیب پر تنقید کیلئے فرانسیسی سیاح اور طبیب فرانسس برنیئر کی یادداشتوں کو ماخذ کے طور پر لیا۔ برنیئر اورنگزیب کے بڑے بھائی داراشکوہ کا ذاتی معالج تھا، بعد میں اورنگزیب کے ساتھ بھی رہا۔ فرانسس برنیئر جہاں داراشکوہ کو اس کے لبرل خیالات کی وجہ سے پسند کرتا تھا وہیں اورنگزیب کو مذہبی ہونے کی وجہ سے ناپسند بھی کرتا تھا۔ اورنگزیب پر جہاں غیر مسلموں سے برے سلوک کے الزامات لگے وہیں یہ الزام بھی لگا کہ اس نے اقتدار کیلئے اپنے تینوں بھائیوں کو قتل کر دیا۔ حالانکہ تاریخی شواہد کو دیکھیں تو معاملہ اتنا سادہ نہیں جتنا دکھایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں اقتدار کی منتقلی کا کوئی باقاعدہ طریقہ کار وضع نہیں تھا۔ جس وجہ سے حکمران کے انتقال کے بعد اس کے بیٹوں میں اقتدار کی رسہ کشی کے واقعات ملتے ہیں۔ بعض اوقات یہ کام دربار میں موجود بااثر امراء کی اکثریت کی حمایت حاصل کر کے پرامن طریقے سے ہو جاتا اور بعض اوقات اس کے لیے لڑائیاں بھی ہوئیں۔ شاہجہان کے چاروں بیٹے داراشکوہ، اورنگزیب، شاہ شجاع اور شاہ مراد مختلف علاقوں کے عامل تھے۔ اورنگزیب نے یقینی طور پر اپنے بڑے بھائی داراشکوہ سے جنگ کی اور اسے قتل کیا۔ لیکن اس کی وجہ دارا کے ملحدانہ خیالات تھے۔ اورنگزیب اسلام سے شدید محبت کرتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ ہندوستان کا اقتدار کسی ایسے شخص کے سپرد ہو جس کا اسلام سے دور دور کوئی واسطہ نہیں۔ داراشکوہ کی موت کے بعد اس کے بیٹے کو داماد بنانا، دارا کے درباریوں اور فوجیوں کو معاف کر دیا۔ اور دارا کا ساتھ دینے والی بہن جہاں آراء کے ساتھ حسن سلوک ظاہر کرتا ہے کہ جنگ کا محرک محض دارا کی مخالفت نہیں تھا۔ اقتدار میں آنے کے بعد اورنگزیب کے اسلام کے نفاذ پر خصوصی توجہ دینا اس بات کی توثیق کرتا ہے۔

استعماری تاریخ نے مسلمان حکمرانوں کو مطلق العنان بادشاہوں کے طور پر پیش کیا۔ اس تاریخ کو پڑھنے والے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اکثر مورخ گورے کے اس فریب کا شکار ہوئے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب 'مغل دربار' میں جہاں ایک طرف یہ لکھتا ہے کہ نظریاتی طور پر مغل بادشاہت کی بنیاد اس تصور پر تھی کہ بادشاہ شریعت سے بالاتر ہستی نہیں ہے۔ اس لئے ایسے خطابات اختیار کئے جاتے جن سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ اسلام کا محافظ، دفاع کرنے والا اور قوت پہنچانے والا ہے۔ مغل بادشاہ خود کو ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوں دونوں کا محافظ سمجھتے تھے۔ دوسری طرف وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس سب کے باوجود سلطنت کے انتظامی معاملات اور آئین جہان بانی و جہاں داری میں یہ بادشاہ لامحدود طاقت رکھتے تھے اور ان معاملات میں وہ شریعت کے قطعی پابند نہیں تھے۔ یہ مورخین سیکولر اور مغرب کے عطا کردہ جمہوری نظریات سے متاثر تھے چنانچہ انہوں نے استعمار کے پیدا کردہ تاثر کو اپنا لیا اس پر مستزاد یہ کہ یہ مورخین حکمرانی سے متعلق اسلام کے احکامات اور ان کی عملی شکل کی سمجھ نہیں رکھتے تھے پس انہوں نے رونما ہونے والے واقعات کی تشریحات سیکولر پیمانوں پر کیں۔

انگریزوں نے اس خطے کی تاریخ کے متعلق اپنی تشریح کو اس خطے کے لوگوں میں پھیلانے کے لیے سر توڑ کوشش کی۔ تحریف شدہ تاریخ انگریزی زبان میں لکھ لی گئی مگر اب اسے ہندوستانیوں کے دماغوں تک پہنچانا ضروری تھا۔ اس کے لئے مکمل لائحہ عمل تشکیل دیا گیا۔ سرکاری نوکری کیلئے انگریزی سیکھنا ضروری قرار پایا۔ نہ صرف یہ بلکہ انگریزی نظام تعلیم کو بھی ہندوستان کے طول و عرض تک پھیلانے کیلئے اسکولوں، یونیورسٹیوں اور کالجوں کا جال بچھایا گیا۔ سب سے پہلے 1857 میں یونیورسٹی آف کلکتہ، یونیورسٹی آف بمبئی اور یونیورسٹی آف مدراس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ 1864 میں گورنمنٹ کالج لاہور کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کا الحاق شروع میں کلکتہ یونیورسٹی سے کیا گیا۔ 1882 میں پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی۔ انگریز کے عزائم پر عملدرآمد کیلئے سرسید بھی پیش پیش تھے اور خصوصا مسلمانوں میں انگریزی زبان اور نظام تعلیم کی ترویج کیلئے علی گڑھ میں 1875 میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج بنایا گیا۔ جو 1920 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بدل گیا۔ اس کے بعد ڈھاکہ، دلی، میسور، پٹنہ، الہ آباد، لکھنو، ناگپور، آندھرا اور کیرالہ یونیورسٹیوں کا قیام بھی عمل میں آیا۔

ان یونیورسٹیز کے علاوہ بہت سے کالجز اور اسکولز بھی بنائے گئے۔ اور ان سب کا مقصد ایک ایسی ایلیٹ کلاس کی تشکیل تھی جو مغربی افکار اور ثقافت سے ہم آہنگ ہو۔ اور برطانوی استعماری نظام کے استحکام کیلئے انگریز حکمرانوں اور ہندوستانی عوام کے درمیان سہولت کار کا فریضہ سرانجام دے۔ ان یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل طلباء میں سے چنیدہ افراد کو مزید اعلیٰ تعلیم کیلئے لندن بھی بھیجا جاتا۔ حیرت انگیز طور پر نام نہاد تحریک آزادی کے تینوں سرکردہ رہنما گاندھی، نہرو اور جناح بھی انہیں چنیدہ افراد میں شامل تھے۔ ان تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم طلباء کو مقامی تہذیب و ثقافت سے دور کرنے اور مغربی تہذیب کے زیر اثر لانے کا پورا پورا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ ذہن سازی کس طرح ہو رہی تھی۔ اس کیلئے چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

1896 میں ایم اے انگلش کے پرچہ میں اردو کا ایک پیراگراف انگریزی میں ترجمہ کیلئے دیا گیا۔ یہ پیراگراف کیا تھا ملاحظہ ہو۔

"ہندوستان کی عورتوں میں جہالت بھری ہوئی ہے۔ اونکے جتنے خیالات ہیں سب بھدے، انکی جتنی باتیں ہیں سب بونگی۔ انکے جتنے طریقے ہیں سب بے ڈھنگے۔ کن کن باتوں کو روئے۔ ملک ان ہی کی وجہ سے تباہ ہو رہا ہے۔ قوم ان ہی کی طفیل برباد ہوئی چلی جاتی ہے۔ ایک مثال لو، ایک نوجوان جو بی اے پاس کر چکا تھا اپنی ماں سے کہنے لگا کہ مجھے لندن جانے دو۔ تین برس بات میں نکل جائیں گے میں بیرسٹری پاس کر کر چلا آونگا۔ یہ سن کر جاہل ماں اسقدر پیٹی کہ ہمسایہ کی عورتیں آگئیں۔ ہر چند عورتیں سمجھاتی رہیں مگر اماں جان کی تو ہچکی بندھ گئی۔"

یہ پرچہ ابھی بھی پنجاب یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری میں محفوظ ہے۔ اور دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح 1899 میں ایم اے انگلش کے پرچے میں دیا گیا اردو کا پیراگراف دیکھئے:

"تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سکندر و قیصر و ماو نپولین جیسے جیسے مرد ہو گزرے ہیں جنہوں نے جو کچھ اونکے سد راہ ہوا اوسکو پامال کیا۔ اور اپنی کمال اولعزمی سے ممالک وسیع کو اطاعت پر مجبور کیا۔ لیکن پہلے کبھی کسی قانون کے پابند بادشاہ کے تخت میں ایسی وسیع سلطنت نے نشو و نما نہیں پایا، ستمبر گزشتہ میں مجھے اس امر پر ذکر کرنیکا اتفاق ہوا تھا کہ گردش زمانہ نے حضرت ملکہ معظمہ کی کونسلوں میں سے حضرت موصوفہ کے وزیر و نکو کسطرح ایک ایک کر کے اوٹھالیا مگر میں اس امر پر طویل تقریر نہیں کرونگا نہ اوس غم کا زیادہ ذکر کرونگا جس سے اونکی علیحدگی نے حضرت ملکہ معظمہ کے دل کو آزردہ کیا۔ لیکن میں پھر کہتا ہوں کہ جس حالت حکمرانی کو شاید ایک ممالک فتح کرنے والا بادشاہ کمزوری خیال کرتا، اوسے حضرت ملکہ معظمہ نے ادائیگی فرض کو ہر وقت مد نظر رکھنے سے اور اپنی عورتوں والی فراست اور عظمت سے ایسا باعزت، مستحکم اور واقعی پر زور بنا دیا ہے کہ ان باتوں میں کوئی بھی تخت برطانیہ کے ساتھ دعویٰ ہمسری نہیں کر سکتا۔"

ملکہ معظمہ کیلئے عورتوں والی فراست اور عظمت جیسے الفاظ۔ اور ہندوستانی خواتین کیلئے جاہل کے خطابات۔ غرض دور غلامی کی یادگار پنجاب یونیورسٹی میں یہ تعلیم دی جا رہی تھی۔ اسی برس یعنی 1899 کا ایک اور پرچہ بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ یہ ایک نواب اور مس صاحبہ کے درمیان مکالمہ ہے۔

"نواب: میں آپ سے کیا کہوں آپ تو جانتی ہی ہیں کہ ہم لوگوں کے یہاں عورتوں کی تعلیم کی کیا حالت ہے اول کوئی عورت پڑھی لکھی ملتی ہیں نہیں جو پوری طرح سے تعلیم دے۔ دوسرے یہاں کی مائیں ایسی اجہل اور لاپرواہ ہوتی ہیں کہ اس طرف کچھ خیال ہی نہیں کرتی ہیں۔ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟ کدھر دیکھوں کدھر نہ دیکھوں مجھکو امور دنیاوی سے اتنی فرصت کہاں ہو گی کہ خود اپنی لڑکی کو تعلیم دوں۔

مس صاحبہ: لیکن اگر کوئی عورت ایسی لائق نہیں ملتی تھی تو آپ کے یہاں مولوی تو ہیں انہیں سے تعلیم دلوائی ہوتی۔

نواب: یہ بھی نہیں ہو سکتا دو وجھوں سے۔ ایک تو یہ کہ جب لڑکی سیانی ہوئی تو مولوی کے سامنے نہیں جا سکتی۔ دوسری ہمارے یہاں کے مولوی بھی عقل کے پتلے ہوتے ہیں۔ طریقہ پڑھانے کا اچھا نہیں جانتے ہیں"

لیں جناب۔۔ یہاں تو ایک ہی جست میں مسلمان عورتوں کے ساتھ ساتھ، پردہ اور مولوی کو بھی نشانہ بنادیا گیا۔ عورتیں جاہل ہیں، تعلیم حاصل کرنے میں پردہ رکاوٹ ہے اور مولوی بھی عقل کے پتلے ہیں۔ ان پرچوں کو حل کرنے کے بعد ایم اے انگلش کرنے والے نوجوان کی ہندوستان کے باسیوں کے بارے میں وہی سوچ پروان نہیں چڑھے گی جو آج حسن نثار اور مبارک علی کی ہے تو اور کیسی سوچ پیدا ہو گی۔

اسی برس کا یونیورسٹی میں داخلے کے امتحان کا انگریزی کا پرچہ بھی دیکھ لیں:

"ایک پادری صاحب چاندنی چوک میں سربازار وعظ کہا کرتے تھے۔ مکتب سے آتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر میں بھی کھڑا ہو جاتا تھا۔ پادری صاحب کے ساتھ کتابوں کا ایک بڑا بھاری ذخیرہ بھی رہتا تھا۔ اور اکثر لوگوں کو اس میں سے کتابیں دیا کرتے تھے۔ ہمارے مکتب کے کئی لڑکے بھی کتابیں لائے تھے۔ انہوں نے کتاب کی جلد تو اکھاڑی لی اور ورقوں کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ کتابوں کی عمدہ عمدہ جلدیں دیکھ کر مجھکو بھی لالچ آیا اور میں نے کہا چلو ہم بھی پادری صاحب سے کتابیں مانگیں۔ مکتب سے اٹھا اور میں سیدھا پادری صاحب کے پاس چلا گیا۔ بہت سے لوگ انکو گھیرے ہوئے تھے۔ انمیں ہمارے مکتب کے دو چار لڑکے بھی تھے۔ لوگ انکے ساتھ کچھ مذہبی بحث کر رہے تھے۔ اس کو میں نے خوب نہیں سمجھا۔ مگر ایک بات تھی کہ اکیلے پادری صاحب ایک طرف تھے اور ہندو مسلمان سیکڑوں آدمی ایک طرف۔ لوگ انکو بہت سخت سخت باتیں بھی کہتے تھے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ضرور لڑ پڑتا۔ مگر پادری صاحب کی پیشانی پر شکن بھی تو نہیں آتی تھی۔ سخت بات سنکر الٹے مسکرا دیتے تھے۔"

اب اس پیراگراف سے یہ سبق ملا کہ مکتب کے طلباء اجڈ اور گنوار ہیں۔ کتابوں کی قدر نہیں جانتے۔ کتابیں لیں بھی تو محض جلدوں کے لالچ میں۔ پادری صاحب تو بہت خوب آدمی ہیں۔ یہ اس صبر و تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کر رہے ہیں جو صرف مغربی تہذیب کی دین ہے۔ اور ہندوستان کے مقامی لوگ مہذب بحث کے بجائے سخت سخت باتیں سنا رہے تھے۔

سن 1900 میں ایم اے انگلش کے پرچے میں جو پیراگراف ترجمہ کیلئے دیا گیا، وہ جنگ آزادی کے تناظر میں تھا:

"غدر کے چوتھے دن کا ذکر ہے۔ کہ ابن الوقت کوئی دو گھڑی دن رہے قلعے کی طرف چلا آرہا تھا۔ ایک آپ تھا اور دو نوکر۔ تینوں مسلح۔ ان دِنوں جب دو آدمی آپس میں بات کرتے تھے تو بس غدر ہی کا مذکور ہوتا تھا۔ یہ لوگ بھی یہی تذکرہ کرتے چلے جاتے تھے۔ جوں ہی محسن خان کے کٹہرے سے آگے اس کھلے میدان میں پہنچے جو میگزین اور کالج کے درمیان واقع تھا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ سڑک کے بائیں طرف انگریزوں کی کچھ لاشیں پڑی ہیں۔ یہ دیکھ کر ابن الوقت کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ابن الوقت لاشوں کے مقابل ذرا سا ٹھٹھکا۔ اور نہایت غصے اور افسوس کے ساتھ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔ دیکھو تو ظالموں نے کیا بیجا حرکت کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے شہر پر بڑا سخت عذاب آنے والا ہے۔ خون ناحق کبھی خالی جاتے نہیں سنا۔"

جی تو یہاں جنگ آزادی میں انگریز کا خون بھی ناحق ٹھہرا۔ آپ اب کس سے آزادی چاہیں گے؟ یہاں تو آپ کے تصور آزادی پر ہی سوالیہ نشان لگ گیا۔ حضرت ملکہ معظمہ کی حکمرانی تو پہلے ہی ہندوستانیوں کے لئے باعث رحمت قرار دے دی گئی تھی۔

یونیورسٹی کی لائبریری کے چند سالوں کے پرچوں کی ایک جھلک تو سامنے آگئی۔ اردو کے علاوہ انگریزی، عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں میں بے شمار ایسی باتیں نصاب کا حصہ بنادی گئیں کہ جنہیں پڑھنے کے بعد بالآخر ایک ایسی نئی نسل نے جنم لیا جو انگریزوں سے مرعوب تھی، اپنی تہذیب کو کمتر سمجھتی تھی۔ اور اس تعلیم نے اس نسل کو اگلی کئی دہائیوں کیلئے مغرب کا ذہنی غلام بنادیا۔

اگرچہ مسلمانوں کے دور حکومت میں ہندوستان ایک پرامن اور خوشحال ملک تھا۔ 1600 عیسویں میں مغل ہندوستان کا جی ڈی پی دنیا کی کل جی ڈی پی کا بائیس فیصد تھا اور 1700 تک بڑھ کر 24 فیصد ہو گیا جو اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ تھا۔ اگرچہ مغل دور حکومت میں آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ زراعت تھی مگر صنعت میں بھی ہندوستان نمایاں تھا۔ اٹھارویں صدی تک دنیا کی پچیس فیصد صنعتی پیداوار ہندوستان میں ہو رہی تھی۔ سڑکوں کی تعمیر اور عمارت سازی میں بھی ہندوستان کسی سے کم نہیں تھا۔ مغل دور میں آرٹیکچر کے ایسے ایسے عجائب بنائے گئے جو کئی صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی دنیا کو حیرت زدہ کر رہے ہیں۔ علوم وفنون، سائنس اور ادب کی دنیا میں بھی مغل ہندوستان اپنی بلندیوں پر رہا۔ مغل حکمرانوں کے علم نواز ہونے کی وجہ سے مشرق وسطیٰ، ایران، ترکی اور عرب سے علماء اور دانشور ہندوستان کھنچے چلے آتے تھے۔ اس سب کے باوجود مغلوں کا ہندوستان آج تاریک دور کیوں سمجھا جاتا ہے؟ اس کی وجہ یقیناً وہ تاثر ہے جو دور غلامی کے دوران انگریز حکمرانوں نے ہندوستانیوں کے ذہنوں میں انڈیلا۔ آج اس غلط تاثر کو ختم کرنا ایک چیلنج ہے۔ مگر وہ وقت دور نہیں کہ جب نبوت کے نقشِ قدم پر قائم ہونے والی خلافت کے تحت مسلمانوں کی کامیابیاں اور فتوحات قلیل عرصے میں اس خطے کے مسلمانوں کے ذہن سے مغرب کی ذہنی غلامی کے تمام تر اثرات کو مٹا دیں گی۔ ان شاء اللہ